

فلپائن، بتاک اور بنگلہ دیش

— کا سفر نامہ —

از مولانا خلیل حامدی - ڈائریکٹر ایڈیٹریٹ اور سرگرم معارف اسلامی منصور، لاہور

جزائر فلپائن | فلپائن کا دار الحکومت نیلا تو تین سال پیشتر دیکھ چکا ہوں۔ اب مورومباہین کی طرف سے ایک عالمی اسلامی کانفرنس کا انعقاد کیا جا رہا ہے اس میں شرکت کی بدولت فلپائن کے جنوبی علاقوں کو دیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ یہ علاقے تاریخ میں "مورومباہین مملکت" کہلاتے رہے ہیں۔ یہ علاقے متعدد جزائر پر مشتمل ہیں۔ مورومباہین مملکت کا سب سے بڑا جزیرہ مینڈاناؤ (MINDANAO) ہے۔ دوسرا جزیرہ زامبوانگا (ZAMBOANGA) ہے چار اور قابل ذکر جزیرے ہیں: پاراوان (PARAWAN) پاسیلان (PASILAN) سولو (SULU) اور تادی تادی (TAWI TAWI)۔ چھوٹے چھوٹے جزیرے بے شمار ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی تعداد سو کے قریب ہو۔ ان جزائر (جو سرزمین مورومباہین کہلاتے ہیں) کے جنوب مشرق میں ملائیشیا کی صباح سٹیٹ ہے۔ مغرب میں بحر الکاہل آرام فرما ہے۔ اور شمال میں دوسرے جزائر ہیں، جو فلپائن کا ہی ایک حصہ ہیں مثلاً جزیرہ لوزون (LUZON) اور جزیرہ بیسایا (VISAYA)۔ یہ دونوں جزیرے عیسائی اکثریت پر مشتمل ہیں۔ آخر الذکر جزیرے میں نیگرو نسل کے قبائل بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں، جو اب عیسائی ہو چکے ہیں۔ ہم اس وقت صرف جنوبی جزایروں کی بات کر رہے ہیں۔ جہاں مسلمانوں نے آزادی کی تحریک چلا رکھی ہے۔

منیلا کی طرف

۱۶ اپریل ۱۹۸۴ء کو خاکسار شام ۱۵ بجے پی آئی اے سے منیلا روانہ ہوا۔
 ۶ گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز بنکاک آئی۔ پی آئی اے کو خاکسار نے ہمیشہ ترجیح دی ہے، لیکن
 اس مرتبہ پی آئی اے سے سخت نفرت ہوئی۔ جہاز والوں نے راستہ کا کھانا جس طرح بھوکے مار کر اور
 انتہائی مفصل کر کے دیا، وہ زندگی میں کبھی نہیں بھولے گا۔ بنکاک میں ۴۰ منٹ گزار کر منیلا روانہ
 ہو گئے۔ ۷ اپریل کی صبح کو منیلا ٹائم کے مطابق خاکسار ۹ بجے صبح پاکستانی ٹائم کے مطابق ۶ بجے صبح
 پہنچ گیا۔ ایئر پورٹ پر چند نوجوان جو خفیہ طور پر پروردگارِ محمداً آزادی سے تعلق رکھتے ہیں، استقبال
 کے لیے موجود تھے۔ ان میں سے ایک صاحب وہ ہیں جن کا لٹکا منصورہ میں سید مودودی انٹرنیشنل
 انسٹیٹیوٹ میں زیرِ تعلیم ہے۔ انہوں نے فوراً اپنا تعارف کرتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا کہ ”میرا
 بچہ سید مودودی انسٹیٹیوٹ کا طالب علم ہے۔“

منیلا ایئر پورٹ کا حسن انتظام | منیلا انٹرنیشنل ایئر پورٹ بڑا کشادہ اور خوبصورت ایئر پورٹ

ہے۔ نظم و نسق کے لحاظ سے بھی اچھا ہے، صفائی کا بھی بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ویزا کے حصول
 کی کارروائی بھی لمحات میں طے پا گئی۔ ویزا آفیسر نے میرا پاسپورٹ لیا اور کسی سوال کے بغیر فوراً
 سیٹمپ لگا کر مجھے دے دیا۔ کسٹم کا نظام بھی ترقی یافتہ ہے۔ اگر مسافر کے پاس کسٹم ڈیوٹی ادا کرنے
 والا سامان ہے تو سرخ لائن کی طرف چلا جائے گا اور اگر ایسا کوئی سامان نہیں ہے تو گرین لائن کا
 رخ کرے گا۔ اور کوئی شخص یہ تحقیق نہیں کرے گا کہ گرین لائن کی طرف جانے والی واقعی کسٹم ڈیوٹی
 ادا کرنے سے آزاد ہے۔ باشعور اور ذمہ داری کا احساس رکھنے والی قوموں کے اندر یہ طریق ترقی ترقی
 مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے۔

منیلا سے کوتا باتو | انٹرنیشنل ایئر پورٹ سے نکل کر ہم لوگ داخلی ایئر پورٹ کی طرف آ گئے۔

دونوں میں کافی فاصلہ ہے، البتہ سواری سستی اور بافراط ہے، اس لیے مسافروں کو بالعموم وقت
 کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ داخلی ایئر پورٹ بالکل ریلوے اسٹیشن معلوم ہوتا ہے۔ ہنگامہ آرائی،
 صفائی سے بے اعتنائی اور انتظار گاہ میں نشستوں کی قلت۔ اس ایئر پورٹ کی چند نمایاں
 علامات ہیں۔ اب میرا رخ جنوبی فلپائن میں جزیرہ بینڈاناؤ کے ایک شہر کوتا باتو (KOTABATO)
 کی طرف ہے۔ منیلا سے کوتا باتو سوا گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ پہلے اعلان میں کہا کہ جہاز دس بجے

دمنیل ٹائم کے مطابق) روانہ ہوگا، پھر تاخیر کا اعلان کیا گیا اور آخر کار بارہ بجے روانگی ہوئی۔ جوہر فوران مجھے چھوڑنے آئے تھے وہ اُس وقت تک ایئر پورٹ پر ہی رہے جب تک میں جہاز میں سوار نہیں ہو گیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ فلائٹ سرے سے منسوخ نہ کر دی جائے۔ جنوبی فلپائن کے حالات میں تدریجاً پیدا ہونا رہتا ہے اور اس کی وجہ سے انتظامات متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ فلپائن میں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں لاتعداد جزیرے ہیں، بلکہ انڈونیشیا کی طرح یہ پورا ملک ہی جزیروں سے عبارت ہے، لیکن تین جزیرے ان میں سب سے بڑے ہیں۔ ایک شمالی جزیرہ لوزون (LOZON)۔ اس جزیرہ کی اکثریت عیسائی ہے۔ دوسرا وسطی جزیرہ ویسایا (VISAYA) ہے۔ بلکہ چند جزیروں کا جھگٹا کہنا بہتر ہوگا۔ اس میں ایک حصہ نیگرو آبادی پر مشتمل ہے اس جزیرے کی اکثریت بھی عیسائی ہے اور تیسرا بڑا اور اہم جنوبی جزیرہ مینڈاناؤ ہے جسے مسلم جزیرہ کہا جاتا ہے۔ ان تمام جزائر کو باہم بحری مواصلات سے بھی ملا دیا گیا ہے اور ہوائی مواصلات سے بھی، بلکہ حیرت ہے کہ ان جزیروں کے اندر متعدد انٹرنیشنل ایئر پورٹ بھی ہیں۔ خود جزیرہ مینڈاناؤ میں چودہ ایئر پورٹ ہیں۔ ان میں دو ایئر پورٹ انٹرنیشنل ہیں۔ ایک کوٹا باٹو ایئر پورٹ۔ اور دوسرا دباؤ (Davao) ایئر پورٹ۔ یہ کثیر التعداد ایئر پورٹ جہاں عوام کو سہولت فراہم کرتے ہیں، اولاً فوجی مقاصد بھی پورے کرتے ہیں۔

چنانچہ جب خاکسار منیلا کے داخلی ائیر پورٹ پر بیٹھا اپنے جہاز کا انتظار کر رہا تھا تو ہر دس منٹ کے بعد ملک کے کسی نہ کسی حصے میں جہاز روانہ ہو رہا تھا۔ انتظار گاہ میں مسافروں کی اکثریت امریکی اور یورپی سیاحوں پر مشتمل تھا۔ ہر سیاح نے ایک ایک دو دو فلپائنی لڑکیاں ساتھ لے رکھی تھیں، جنہیں وہ پورے ایام سیاحت میں رفیق سفر بنائے رکھیں گے۔ فلپائن ایک غریب ملک ہے اس لیے دولت مند سیاحوں کی چراگاہ بنا ہوا ہے۔ غربت کے ساتھ غیر موثر عیسائی مذہب بھی شامل ہو گیا ہے۔ اس لیے لوگوں کے اخلاق و کردار اور ضمیر پر کسی بالاتر طاقت کا کنٹرول نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلپائنی عیسائی لڑکیاں سیاحوں کے انتظار میں ماری ماری پھرتی رہتی ہیں۔ اس بات پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر

لہ آندوی نسوان کی شاہ راہ کی یہ اہم منزل ہے۔ (دے۔ ص)

بجالاتے ہیں کہ فلپائن کی مسلم آبادی بڑی حد تک اس اباحت سے پاک ہے۔ اسے خدا اور آخرت پر ایمان رکھنے کا کرشمہ کہہ سکتے ہیں، ورنہ مسلمان آبادی عیسائیوں سے زیادہ مفلوک الحال اور منظوم ہے۔

انتظار نگاہ میں مجھے پاکستانی لباس میں دیکھ کر ایک صاحب فوراً میری طرف لپکے۔ مجھے السلام علیکم کہا اور پھر فوراً کہنے لگے: "میں سببو (SEBO) کا رہنے والا ہوں (یہ VISAYAS) آئی لینڈ میں واقع ہے) وہاں میری کارپٹ کی فیکٹری ہے۔ میں مسلمان ہوں اور سچ بھی کہ چکا ہوں۔ اگر آپ کو سببو آنے کا موقع ملے تو مجھے ضرور پیسے۔ میں اور میرے دوسرے مسلمان بھائی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔" دور دراز جزیرے کے اندر بسنے والے ایک مسلمان کے یہ جذبات بڑے قابلِ قدر ہیں۔ اس نے مجھے صرف لباس اور چہرے سے پہچانا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور پھر بر ملا محبت و عقیدت کا اظہار شروع کر دیا ہے۔ دراصل اسلام ایک عالمی مذہب ہی نہیں، بلکہ ایک عالمی سوز و گداز کا نام ہے۔ دل دلوں کو اور روح رُوحوں کو فوراً پہچان لیتی ہے اور پھر رنگ و نسل اور زبان و زمین کے غیر معمولی تفاوت کے باوجود محبت و عقیدت کے پاکیزہ و پائیدار رشتے جوڑ میں آجاتے ہیں۔ لَوْ اَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ مَا اَلْفَتْ بَيْنَهُمْ وَلَٰكِنْ اَدَلَّتْ اَلْفَ بَيْنَهُمْ۔ ارشادِ خداوندی ہے جس کی صداقت قدم قدم پر کرشمے دکھا رہی ہے۔ منیلا سے کوتا بانو ایک گھنٹے اور ۱۵ منٹ کا سفر ہے۔ ہم بوننگ میں جا رہے ہیں۔ جہاز کے درپچوں سے جھانک کر دیکھیے تو نیچے عجیب متطر دکھائی دیتا ہے۔ ابھی ہم سمندر کے اوپر سے گذر رہے ہیں۔ اور اب ایک شاداب جزیرے کے اوپر آگئے ہیں۔ پھر سمندر اور پھر جزیرہ۔ سمندر بحر الکابل کا ایک حصہ ہے اور حسبِ عادت خاموش و پرسکون۔ جزیرے ہرے بھرے کھیت اور پہاڑوں سے عبارت۔ عجیب و غریب دنیا۔ اگر اس کا خلاصہ نکالیں تو صرف اتنا کہنا کافی ہو گا کہ، "دنیا بے آب و گیاہ۔"

کوتا بانو ایئر پورٹ پر ہمارے معزز میزبان استاذِ عمر باسیجان صاحب اور ابو خلیل صاحب اپنے کثیر فوجوانوں کے ساتھ استقبال کے لیے آتے ہوئے تھے۔ تحریکِ اسلامی پاکستان کے ایک کارکن سے ان نوجوانوں کی قلبی محبت ان کے چہروں پر بے شائبہ برسر رہی تھی۔ بعض

نے عربی زبان میں خاکسار کا خیر مقدم کیا اور اکثر نے اپنی قومی زبان مجنداناؤ میں - ہاتھوں اور آنکھوں کے اشارے سے جذبات اندروں کی شدید بلچل کی غمازی کر رہے تھے۔ یہ نوجوان مورو ہیں۔ اور اسلام اور وطن سے ان کی محبت ان کی روحوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔ ایک طرف خواتین کی جماعت بھی کھڑی تھی۔ ابو خلیل یحییٰ نے بتایا کہ یہ مسلم خواتین بھی استقبال کے لیے آئی ہیں انہیں بھی شوق ہوا کہ دور سے آنے والے مہمان کا خیر مقدم کر کے اپنے اسلامی جذبہ کا اظہار کریں۔ یہ ہیں مورو مسلمان مرد اور خواتین۔

کوٹنا باتو شہر | کوٹنا باتو شہر کے اطراف کیا ہیں بہ بوستان و گلستان، ناریل کے دراز قدرہ دل افروز درختوں کی قطاریں، کیلوں کے جھنڈے، آموں، شریفوں اور چیکو کے اشجار۔ دلفگار کے باغات۔ گونا گوں بچھو لوں کے بو قلموں کلیوں کی عطر بیزی۔ یہ مناظر قدرت کے حسن و جمال کا ایک ایسا آئینہ ہے جسے دیکھ کر انسان خدا پر ایمان کی لذت محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایئر پورٹ سے ہمارا پورا قافلہ کوٹنا باتو شہر کو چل پڑا۔ موسم گرم ہے، لیکن درختوں کے سائے اور زمین کی ٹھنڈک اور سبزے کی بہتات اس گرمی کو برابر چوستی جا رہی ہے۔ ابو خلیل یحییٰ صاحب نے مہمانوں کے لیے شہر کے ایک ہوٹل الگورازون میں ٹھہرنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ یہ ہوٹل بالکل نیا ہے اور اس کا مالک ایک مسلمان ہے۔ راقم نے ابو خلیل سے کہا کہ آپ لوگ اس قدر تکلیف نہ اٹھائیں جس کسی معمولی جھونپڑی میں بھی گزارا کر سکتے ہوں۔ آپ لوگ افغانیوں کی طرح دُور جہاد سے گزر رہے ہیں، اس لیے مناسب یہ ہے کہ مالی وسائل کو جس قدر بچایا جاسکتا ہو بچایا جائے۔ ابو خلیل یحییٰ صاحب نے یہ کہہ کر راقم کی بات ٹال دی کہ دو ایک روز میں ہوٹل خالی کر کے کسی دوست کے گھر میں بسیرا کر لیا جائے گا۔ سردست ہوٹل میں آرام کریں۔

الگورازون ہوٹل میں | ابو خلیل یحییٰ اور ان کے جملہ رفقاء واپس چلے گئے۔ علی خنافی نامی ایک

نوجوان کو ہوٹل میں میرے ساتھ چھوڑ گئے کہ یہ خدمت اور حفاظت دونوں کام سرانجام دے گا۔ خدمت کا مطلب تو سمجھ میں آ جاتا ہے، لیکن حفاظت کا مطلب بعد میں سمجھ آیا۔ وہ یہ کہ اس شہر ہی کے نہیں، بلکہ اس پورے علاقے کے حالات معمول پر نہیں رہتے۔ سرکاری فوج اور مورو

محاذِ آزادی کے مجاہدین میں وقتاً فوقتاً جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں، اس لیے حکومت کی طرف سے ہر شخص کی نگرانی رکھی جاتی ہے۔ سرکاری کمانڈو دن رات ادھر ادھر سونگتے رہتے ہیں اور جہاں کہیں انہیں کوئی "مشتبہ" آدمی نظر آئے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ میں گو غیر ملکی ہوں، مگر پھر بھی کسی مقامی انسان کا ہر وقت میرے ساتھ رہنا ضروری ہے۔

الکورا زون ہوٹل بالکل نیا ہوٹل ہے۔ اس علاقے میں لکڑی یا فراط پائی جاتی ہے۔ اس لیے تعمیر میں لکڑی فراخ دلی سے استعمال کی گئی ہے۔ فرنیچر بھی لکڑی کا ہے اور مقامی سٹریو کی قابلیت کا اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس فن میں مسلمان پیش پیش ہیں۔ الکورا زون ہوٹل جس روڈ پر واقع ہے وہ بڑی آباد ہے۔ یہاں کبھی ہوٹل کی بالکونی میں آکر بیٹھتا ہوں تو میری نگاہ دور دور تک مورولینڈ کا مشاہدہ کرتی رہتی ہے۔ شہر کے اکثر مکانات کچھریل کے بنے ہوئے ہیں یا پھر ٹین کی لمبی اور ترچھی چھنیں ہیں، البتہ چند عمارت بڑی پرشکوہ نظر آتی ہیں۔ یہ بنک ہیں، کیتھولک یا پروٹسٹنٹ چرچ ہیں یا عیسائی مشنریوں کی یونیورسٹی ہے جسے (NOTRE DAME) یونیورسٹی کہا جاتا ہے، یہودی اور عیسائی تاجروں کے بڑے بڑے سٹور ہیں، سینما ہال اور گورنمنٹ دفاتر ہیں۔ چند ایک مسلمانوں کی عمارت بھی ہیں، مگر عیسائیوں کی عمارت کے مقابلے میں بیچ۔ باقی پورا شہر ٹین یا پھوس کے لپست مکانوں پر مشتمل نظر آتا ہے

لطف بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

پہن رنگارنگ ہے آئینہ بباد بہاری کا

راقم نے ہوٹل میں اترتے ہی اپنے محافظ سے عرض کیا کہ ایک دن اور ایک رات کا تھکا ہوا ہوں۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔ دو تین گھنٹے کی نیند کے بعد راقم جب اٹھا تو علی خنانی متعدد زائریں سے آہستہ آہستہ محو گفتگو تھا۔ یہ لوگ خاکسار سے ملنے آئے ہیں، مگر علی خنانی نے انہیں روک رکھا ہے۔ علی خنانی نے بتایا کہ یہ لوگ میرے لیٹ جانے کے فوراً بعد ہی آگئے تھے، مگر ملاقات کے لیے بیٹھے گئے۔ کسی دور مقام سے آئے ہیں، اس لیے واپس جانے سے پہلے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک صاحب کالوا کا منصورہ میں سید موڈودی انسٹیٹیوٹ میں پڑھتا ہے۔ وہ اظہارِ تشکر کے لیے آئے ہیں۔

دوپہر کا کھانا ہوٹل میں کھایا۔ یہاں کی بنیادی خوراک چاول اور مچھلی ہے۔ روٹی کے تصور سے لوگ نا آشنا ہیں۔ ڈبل روٹی کا قدر سے رواج ہے۔ سٹیپوں کی آمد کی وجہ سے ہوٹل میں یورپی طرز کے کھانے کا اہتمام کر لیا جاتا ہے۔ راقم ان تکلفات سے بری ہے جو میسر آیا، کھالیا۔

کوئنا باتو کی معاشرتی زندگی | پچھلے ٹائم راقم اور علی خناتی شہر کی سیر کو نکل گئے۔ اس شہر کی آبادی علی خناتی کے کہنے کے مطابق زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ ہوگی۔ یہ سینڈاناؤ جزیرے کا سب سے بڑا شہر ہے۔ پورے جزیرے کی آبادی بیس لاکھ کے قریب ہے۔ کوئنا باتو شہر کی سڑکیں کشادہ ہیں۔ شہر کے وسط میں ایک وسیع پارک ہے جس میں ایک طرف عیسائیوں نے حضرت مسیح اور مریم علیہا السلام کے مجسمے حسبِ عادت نصب کر رکھے ہیں اور دوسری طرف مور و مسلمانوں کے ایک قومی ہیرو کا مجسمہ ہے جس کا نام حسین المسلمان ہے۔ یہ شخص ڈاکٹر آف میڈیسن تھا اور اس نے اپنی قوم کی بڑی خدمت کی ہے۔

پارک کے اندر جگہ جگہ سیمینٹ کے بچ رکھے ہوئے ہیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں گروہ درگروہ ادھر ادھر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پارک کے فٹ پاتھوں پر بوڑھی عورتیں اور نوجوان بچیاں بھی چھا بڑیوں میں سامان رکھ کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ ان چھا بڑیوں میں فروٹ، انڈے، بسکٹ، دیاسلاٹیاں اور اسی نوعیت کی اور چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ بیچنے والے بھی فقیر اور ان کے خریدار بھی فقیر۔ مردوں کا لباس پتلون اور قمیص اور عورتیں اسکرٹ پہنے ہوئے۔ کچھ عورتوں نے اسکرٹ کے اوپر لنگی باندھ رکھی ہے۔ سرسب کے ننگے۔ ان چھا بڑی فروشوں کی اکثریت مسلمان ہے۔ پارک میں بیٹھنے والے گروہ اکثر بے روزگاری کے ستائے ہوئے یہاں آ کر وقت گزارتے ہیں اور کچھ سیر و تفریح کرنے والے منچلے بھی ہیں۔ سبزی مارکیٹ کے پاس سے گزرے، پورا بازار پھیلوں سے بھرا ہوا ہے۔ ناریل، انناس، تریوز، آم، چیکو، کیلا، شریفی ڈمبیروں پڑا ہے اور بیچنے والی سب عورتیں سن رسیدہ بھی اور نوجوان بھی۔ اور سب مسلمان۔ مرغی، انڈے، کباب، مچھلی تلی ہوئی، سموسوں سے ملی جلتی سی اشیاء، اس طرح چاول، چینی، ایندھن اور سبزی پر سب اس بازار میں ملتی ہیں اور یہ پوری

سروس عورتیں اور لڑکیاں انجام دیتی ہیں۔ بازار میں صفائی نہیں ہے۔ کم مایہ دکانداروں کا جو حال ہوتا ہے یہ مارکیٹ اس کی صحیح تصویر پیش کر رہی ہے۔ چاول کی قیمت ایک کلو ۳ پیسو سے لے کر ۱۴ پیسو تک (فلپائن پیسو پاکستانی روپے کے برابر ہے) چیکو ۵ پیسو کلو، کیل ۵ پیسو کا ایک گچھا (جس میں دو درجن سے زیادہ ہی کیلے ہوتے ہیں)۔ سوختی لکڑی کا ایک گچھا ایک پیسو (جس کا وزن تین کلو سے زیادہ ہوگا) میں فروخت ہوتا ہے۔ زندہ مرغی ۲۵ پیسو میں بکتی ہے۔ اور ابل ہوا اٹڈہ دو پیسو میں۔ علیٰ خنانی نے بتایا: ہم لوگ سخت گرانی محسوس کر رہے ہیں۔ بیروزگاری عام ہے۔ کا دو بار زندگی محدود ہے۔ اچھے سے اچھا روزگار ۱۵ پیسو بومیہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر آمدنی کا یہ حال ہو تو پھر گھٹیا چاول جو عام خوراک ہے ۳ پیسو کھو بھی بہت بوجھ محسوس ہوا ہے۔ مستی چیز یہاں کی مچھلی ہے۔ جسے کچھ دست یا ب نہ ہو وہ مچھلی پڑ کر پکا لیتا ہے یا کپتیا کیل ابال کہ شکم پڑی کہ لیتا ہے۔

عیسائیوں کے اخراجات | کوتا با تو مسلمانوں کا تاریخی شہر ہے۔ یہاں مسلم سلاطین کا اقتدار رہا

ہے۔ اب اس شہر میں گرجوں کی تعداد زیادہ اور مسجدوں کی تعداد بہت کم ہے۔ پورے شہر میں شاید دس سے زیادہ مسجدیں نہ ہوں گی جب کہ گرجا قدم قدم پر طے گا۔ عیسائیوں کے دونوں فرقے یہاں سرگرم عمل ہیں؛ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ۔ گرجوں کے علاوہ ان کی کئی عمارت ہیں۔ NOTRE DAME یونیورسٹی کا پیچھے تذکرہ گزر چکا ہے۔ اور بھی ان کے کئی کالج اور تعلیمی و فنی ادارے اور اسپتال ہیں۔ کوتا با تو کا سب سے عظیم الشان اسپتال عیسائی مشنری کا ہے۔ بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں ان کے ہاتھ میں ہیں، بڑے بڑے سرکاری مناصب پر یہ براجمان ہیں، جاگیروں اور میاں باغات کے مالک یہ ہیں۔ اس علاقے میں گو یہ اقلیت میں ہیں اور یہ زیادہ تر لوزون جزیرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور فلپائن کا دار الحکومت منیلا ان کا مرکز ہے، مگر جزیرہ مینڈاناؤ اور دیگر مسلم جزائر پر ان کا معاشی و ثقافتی اور سیاسی غلبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوتا با تو کو مسلم شہر ہے، مگر یہاں عربیاتی کارواج ہے، شراب خانے کھلے ہوئے ہیں اور مخلوط معاشرت کے خوفناک مناظر ملتے ہیں۔

کوتا با تو کی مسلمان آبادی اپنے ہی شہر اور اپنے ہی تاریخی وطن میں اکثریت کے باوجود تنہا دست

اور خستہ حال ہے۔ چھوٹی سطح کی دکانداری، اٹھائی گیری، پھیری، ماہی گیری اور معمولی دستکاری پر ان کا معاشی دار و مدار ہے۔ میں نے علی ختانی سے پوچھا کہ کیا مسلمان گھرانے پر پسند کرتے ہیں کہ ان کی سن رسیدہ ماہیاں اور نوخیز دوشیزائیں بازار میں کھوکھے کھولیں اور چھابڑی لگائیں؟ علی نے جواب دیا کہ مسلمانوں کے پاس یہی کام ذریعہ معاش ہیں۔ اگر اتنا بھی نہ کریں تو کہاں سے کھائیں۔ ان کے مرد بھی کھاتے ہیں اور عورتیں بھی، تب جا کر گزربسر ہوتی ہے۔ اچھے حالات میں کوئی شخص یہ گوارا نہیں کرتا کہ اُس کے بچے اور بچیاں تعلیم و تربیت کے بجائے بازار میں بیٹھ کر چند پیسہ کمانے کی فکر میں رہیں۔

۱۸ اپریل ۱۹۸۲ء کو صبح ناشتے میں بھی چاول ابلے ہوئے انڈوں کے ساتھ کھاٹے۔ چائے کی جگہ بیرہ کافی دے گیا۔ اسی ہلکے ٹھیکے ناشتے پر گزارا کر لیا۔

ایک مورونوجوان | علی ختانی میرا رفیق ہوٹل بڑا باشعور نوجوان ہے۔ اُس نے مجھ سے "بنگسا مودو" (انگریزی کی کتاب جسے ہم نے ادارہ معارف اسلامی کی طرف سے چھاپا ہے) لے لی۔ اور راتوں رات کافی پڑھ ڈالی۔ اس کتاب میں جنوبی فلپائن یعنی مورولینڈ کی تاریخ اور ان کے سلاطین کی داستانیں اور ان کی جنگی کارروائیاں بیان کی گئی ہیں۔ علی نے شاید پہلی مرتبہ ایک ایسی کتاب دیکھی ہے جو اس کی اپنی تاریخ اور اپنی تصویر حیات پیش کرتی رہی ہے۔ اُسے شوق ہے کہ مجھے اپنے ملک کے حالات سنائے۔ ایک نوجوان ہونے کی حیثیت سے اُس کے جذبات ابلتے ہیں اور پھر گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ اُسے اس بات پر بہت دکھ ہے کہ کوئی بات تو کے تمام جدید تعلیم کے ادارے عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اُس نے بتایا کہ اس شہر میں عیسائیوں کی دو یونیورسٹیاں ہیں ان کے اساتذہ عیسائی ہیں اور طلباء تو سے فی صد مسلمان۔ تعلیم تو سیکولر ہے، مگر عیسائیت کی تبلیغ زور و شور سے کی جاتی ہے۔

ایک مورونوجوان | ناشتے سے فارغ ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ مجھناؤ - MAGUIN

DANA - کا ایک وفد علی اسماعیل صاحب کی قیادت میں خاکسار سے ملنے کے لیے آیا۔ مجھناؤ کو تو باتو سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک تاریخی مقام ہے۔ علی اسماعیل نہایت فصیح عربی بولتے ہیں۔ انہوں نے مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے۔ مجھے بتانے لگے کہ میں نے مدینہ یونیورسٹی میں

مولانا مودودیؒ کو دیکھا تھا! اور ان کی تقریر بھی سنی تھی۔ اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کر کے کہنے لگا کہ مولانا مودودیؒ اس دور کے عظیم اسلامی مفکر گذرے ہیں۔ ان کی کتابیں صحیح معنوں میں اسلام کا راستہ واضح کرتی ہیں۔ علی اسماعیل کے ساتھ جو لوگ ہیں وہ بھی عربی بول لیتے ہیں۔ راشد مام اور شہاب الدین دونوں عربی میں گفتگو کر لیتے ہیں۔ صرف طیب طاہر نامی ایک ساتھی عربی سے ناواقف ہے۔ علی اسماعیل نے بتایا کہ مجنداناؤ میں "مجنداناؤ مسلم ایسوسی ایشن" کی طرف سے ایک تعلیمی ادارہ کھولا گیا ہے جس کا نام ہے المجدد الرحمانی العربی الاسلامی۔ وہ (علی اسماعیل) اس محمد کے ڈاٹر کٹر ہیں۔ راشد مام اس کے اسٹنٹ ڈاٹر کٹر ہیں اور دیگر رفیق اس کے ٹیچروں میں شامل ہیں۔ اس محمد میں ۸۰۰ لڑکے اور لڑکیاں پڑھتے ہیں۔ مختلف شہروں اور جزیروں میں اس کی ۸ شاخیں ہیں جن میں تعلیم پانے والے لڑکے اور لڑکیوں کی مجموعی تعداد دو ہزار سے زائد ہے۔ یہ محمد ثانوی درجے کا ہے جہاں سے فارغ ہونے والے کو مدینہ یونیورسٹی میں داخل کر لیا جاتا ہے۔

مور کی تعلیمی پس ماندگی | علی اسماعیل اچھا باشعور، صاحب علم اور فعال آدمی نظر آتا ہے۔

تعلیمی امور پر بحث کرتے ہوئے کہنے لگا کہ جنوبی فلپائن کا مسلمان تعلیم میں بہت افسانہ ہے، خصوصاً جدید تعلیم اور ٹیکنالوجی سے بڑی حد تک بے بہرہ ہے۔ اب مسلمان اپنی کوششوں سے کچھ جدید تعلیمی ادارے قائم کر رہے ہیں، مگر وہ بھی ثانوی تعلیم سے آگے نہیں بڑھ پائے۔ سرکاری جامعات اور مسیحی جامعات میں اگر ہم اپنے نوجوانوں کو مجبوراً تعلیم کے لیے بھیجتے ہیں تو ان کا دین اور اخلاق دونوں خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ علی اسماعیل جب یہ بات کر رہے تھے تو اس کے چہرے پر غم کے آثار بھی ابھر آئے اور غصے کے بھی۔

داستانِ جہاد | اب علی اسماعیل نے تعلیم کا موضوع چھوڑ کر جہاد کا موضوع چھیڑ دیا۔ یہ موضوع پہلے

موضوع سے بھی زیادہ حساس ہے، لیکن آپ جس مور و مسلمان سے ملیں خواہ وہ سرکاری ملازم ہو یا مزدور وہ جہاد کی کہانی بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ موضوع چھیڑ کر وہ اپنے دل کے تاری بھی ہلا دیتا ہے۔ اور سامع کے دل کے تاری بھی زیر مضراب آجاتے ہیں۔ مور و جہاد کی داستان تو بہت لمبی ہے اور قدیم بھی، مگر اس سلسلے کی آخری داستان نے مور و مسلمانوں کے اندر گہرے زخم لگائے ہیں۔ ابھی تک ان سے ٹیس اٹھ رہی ہے۔ یہ داستان ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۶۶ء تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ عرصہ تو صرف ۶ سال کو محیط ہے مگر اس کے نقوش و آثار آئینہ اور اس کے نتائج و عواقب لامتناہی ہیں۔

جہاد اور اس کے نتائج

یہ موقع اس داستان کی تفصیل و تجزیہ کا نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء میں موروسلمانیوں نے "موروس محاذ آزادی" کے تحت مارکوس کی صلیب پرست اور غاصب حکومت کے خلاف جنگ آزادی شروع کی۔ اس جنگ کی قیادت صرف موروس محاذ آزادی تنظیم کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمان عوام نے اس جنگ میں محاذ آزادی کا پورا پورا سامنے دیا۔ باہر سے بھی بعض ممالک کی جانب سے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ آخر کار مارکوس گفت و شنید پر آمادہ ہوا۔ طرابلس (لیبیا) میں قذافی کی وساطت سے موروس محاذ کے لیڈروں جن کی قیادت محاذ کا صدر نور مسواری کر رہا تھا۔ اور مارکوس کے نمائندوں (جن کی قیادت مارکوس کی بیوی "حسینہ فلپائن" کر رہی تھی) کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ یہ معاہدہ "طرابلس ایگریمنٹ" کے عنوان سے معروف ہے۔ اس معاہدے کی رو سے مارکوس نے یہ وعدہ کیا کہ اگر موروس محاذ جنگ بندی کا اعلان کر دے تو وہ جنوبی فلپائن کو علاقائی خود مختاری (ریجنل اٹانومی) دے دے گا۔ اس معاہدے میں نور مسواری نے کمزوری دکھائی نیز خیال رہے کہ آج تک مارکوس نے اس معاہدے پر عملدرآمد نہیں کیا۔ علی اسماعیل کے بیان کے مطابق نور مسواری نے تحریک جہاد کے ساتھ خیانت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محاذ کے تمام نمایاں کمانڈر نور مسواری کے خلاف ہو گئے اور انہوں نے لکھ کر دے دیا کہ وہ نور مسواری کو اپنا نمائندہ نہیں سمجھتے۔ سلامت ہاشم محاذ کے نائب صدر تھے۔ تمام کمانڈروں نے انہیں اپنا رہنما تسلیم کر لیا۔ موروس نے بھی ایک متفقہ فتویٰ صادر کر دیا جس میں نور مسواری کے بجائے سلامت ہاشم کو قائد تسلیم کر لیا گیا۔ اس وقت سے تمام موروسلمانی سلامت ہاشم کے ساتھ ہیں۔ ان تمام جزائر میں سلامت ہاشم کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ اہل دین و اہل دعوت اور اسلام سے محبت رکھنے والا کوئی شخص جیسا نہ ہوگا جو سلامت ہاشم کا ساتھ نہ دیتا ہو۔ نور مسواری اپنی مقبولیت کھو چکا ہے۔ جزیرہ سولو (SULU) اور جزیرہ تاوی تاوی (TAWI TAWI) کے کچھ لوگ نور مسواری کے ساتھ ہوں گے۔ کیونکہ نور مسواری اسی جزیرے کا رہنے والا ہے، نیز کچھ بائیں بازو کے عناصر اور اشتراکیت نواز نوجوان نور مسواری کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی بھاری اکثریت مرد، عورتیں اور بچے تک سلامت ہاشم کے حامی ہیں۔

(باقی)